⊙ ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ اسلامیہ کالج، سول لائنز، لاہور

شاملِ شورِ جہاں اِک نحیف آواز

(مجید امجد اور اکیسویں صدی کا نظامِ زر)

Abstract:

Majeed Amjid(1914-1974) is an eminent Urdu poet of 20th century, his multi dimensonal poetry distinguished him from the poets of his era. This article studies his poetry in the context of a social and econmic ideology of 21st century called CAPITALISM. This doctrine penetrates deep into the society since it is based on the technoogical revolution and on the internalization of the market.Basically Majeed Amjid is a poet of aesthetic values of literature.He has not expressed his vision explicitly rather symbloically and metaphorically, this is why, some progressive writers criticize his approach towards socio- eonomic issues. This article deconstructs some of his selective poems to bring forward his views towards capitalism.

Keywords:

Majeed Amjad Poetry Poem Capitalism Progressive

مجید امجد اور اکیسویں صدی کا نظامِ زر: اس عنوان میں بہ ظاہر ایک تناقض ہے۔ یہ تناقض اکیسویں صدی کی تحدید اور مجید امجد کے کلام کے زمانہء تخلیق کی وجہ سے جنم لیتا ہے۔ اکیسویں صدی کا یہ نظامِ زر مابعد جدیدیت اور عالم گیریت کا معاشی پہلو ہے۔ اگرچہ اس کے ابتدائی خدوخال دوسری جنگ عظیم کے بعد اُبھرنا شروع ہو گئے تھے لیکن اس سرمایہ دارانہ معاشی منصوبے کی تکمیل بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کے آغاز میں ہوئی۔ یہ صنعتی عہد کا تاریخی نتیجہ نہیں ہے لیکن اسے Post Industrial عہد کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ نظام سرمایے کی کھپت اور اضافے کو ترجیحی قدر کے طور پر پیش کرتا ہے اور فری مارکیٹ اکانومی، نیولبرل ازم اور کنزیومر اکانومی جیسے معاشی تصورات کی مدد سے اپنی حیثیت اور حاکمیت کو باور کراتا ہے۔ یہ نظام لامرکزیت، لاتعلقی، ورائے قومیت اور سرد مہری سے عبارت ہے۔

یہ اپنی غایت میں معاشی نظام ہے مگر اس وقت بین الاقوامی سرحدوں کو توڑ کر دنیا بھر کی ثقافتوں اور سماج کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ یہ انسان اور سماج کے ایک نئے رشتے کی تعبیر کرتا ہے اور یوں اکیسویں صدی میں انسان کا ایک نیا تصور خلق کرتا ہے جس کی رُو سے نہ صرف انسان بل کہ فطری مظاہر، ثقافتی اوضاع، تاریخ، ادب حتیٰ کہ کھیل، موت اور قبریں تک قابلِ صرف اشیا میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ جس کا لامحالہ نتیجہ انسان کی الگ وجودی شناخت کی تنسیخ اور لایعنیت کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ ارون دھتی رائے نے اس مطلق العنان ''بادشاہ'' کی دلچسپ تجسیم کی ہے:

> ''طاقت ور، بے رحم اور سرتاپا مسلح۔ اس قسم کا بادشاہ دنیا نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ خام سرمایا اس کا میدان ہے اور ابھرتی ہوئی رنڈیاں اس کی فتوحات ہیں۔ منافع اس کی دعا اور عبادت ہے۔ اس کی سرحدیں لامحدود اور اس کا اسلحہ جوہری ہے۔ اسے چشمِ تصور میں لانا یا چشمِ تصور میں لانے کی کوشش کرنا، اس کے پورے وجود کو اپنی سوچ کے احاطے میں لانا ایسے ہی ہے جیسے آپ، خود کو عقل و خرد اور جنون کی سرحد پر بٹھا کر دنیا کو دعوتِ عام دیں کہ آؤ اور میرا مضحکہ اڑاؤ۔'' (۱)

مجید امجد نے اپنی آواز کو اس شورِ جہاں میں شامل کیا ضرور مگر یہ نظام زر اُس کا بنیادی سروکار یا اس کی شاعری کا فوری سیاق نہیں ہے البتہ مجید امجد کے کلام کی تلازماتی اور استعاراتی و علامتی جہات کی تعبیر اس تناظر میں ضرور کی جا سکتی ہے۔ مجید امجد بنیادی طور پر ادب کی جمالیاتی اقدار کا شاعر ہے۔ ترقی پسند مکتب فکر کی طرف سے یہ اعتراض کہ ''زمانے کے آشوب اور عصری مسائل و حالات سے زیادہ وہ اشیا اور عناصر و مظاہر پر نگاہ رکھتے ہیں'' (۲) شاید اسی تناظر میں تھا کہ مجید امجد کے ہاں مزاحمت کا وہ انداز نہیں ملتا جو اس وقت کی ترقی پسند فکر کا تقاضا تھا۔ ایک آدھ استثنائی مثال کے علاوہ (جس کا ذکر آگے آئے گا) اس کے ہاں احتجاج اور ردِعمل کی لَے بلند آہنگ ہونے کے بجائے دھیمے سُروں میں تخلیقی تجربے کا حصہ بن کر سامنے آئی ہے۔ وہ اپنے زمانے کی اپس ٹیم سے پوری طرح آگاہ تھا۔ یہاں تک کہ مجید امجد کی اکثر رومانی، حزنیہ اور فطرت اساس شاعری میں بھی اس کی بیدار عصری حسیت اور اس کا فعال شعور طوق، سلاسل، زنجیر، آتشیں آہن، تخت و کلاہ اور فصیل قصر جیسی تراکیب، علامتوں اور استعاروں میں ظاہر ہوا ہے جو مزاحمتی شعری روایت کا حصہ ہیں۔ لیکن سردست ہمارا سروکار موجودہ نظامِ زر میں مجید امجد کی اُس معنویت سے ہے جو زمانی بعد کے باوجود اُسے ہمارا لازمانی معاصر باور کراتی ہے۔ اس ضمن میں دو باتیں پیشِ نظر رہنی چاہئیں: اول یہ کہ زمانۂ تخلیق کسی متن کا خارجی حوالہ ہے۔ متن کے معنی خارجی حوالے کے بجائے اندرونی لسانی نظام، Signifieds کے ارتباط و افتراق، ثقافتی رسمیات اور علامتی و استعاراتی جہات سے قائم ہوتے ہیں۔ دوم یہ کہ معنی اور معنویت میں فرق ہے ''معنی دراصل وہ بنیادی مفہوم ہے جو شعری متن کے فوری سیاق، اس کے آس پاس کے صنفی و شعریاتی منطقے کو ملحوظ رکھنے سے برآمد ہوتا ہے۔'' لیکن ''جب شعری متن اپنے سیاق سے گریز کر کے کسی دوسرے تناظر میں قدم رکھتا ہے، یعنی کسی دوسرے زمانے، کسی مختلف صورتِ حال، کسی نئی فکر، کسی نامانوس معنیاتی فضا میں اسے پڑھا جاتا ہے اور اس کی تعبیر کی کوشش کی جاتی ہے تو اس کے نتیجے میں جو کچھ ہمارے ہاتھ آتا ہے، وہ متن کی معنویت ہے۔'' (۳)

بیسویں صدی کے فکری رجحانات کے تناظر میں مجید امجد کے شعری متون کی جو تعبیرات سامنے آئی ہیں وہ

گزشتہ پیراڈائمز اور تنقیدی معیارات کا ثمر ہیں، جب کہ اکیسویں صدی کے تناظر میں ان متون کی نئی معنویت قائم ہوتی ہے۔ اس تقابل اور نئی معنویت کی تلاش میں مجید امجد کی کچھ معروف نظمیں ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کراتی ہیں۔ ان نظموں کے کثیر علامتی ابعاد اور اور کھلی اطراف متن کی ردِ تشکیل کا مطالبہ کرتی ہیں۔ مثلاً مجید امجد کی شاعری پر قائم ہونے والے تنقیدی ڈسکورس میں نظم 'پنواڑی' کا حوالہ کثرت سے آیا ہے۔ ناقدین کا خیال ہے کہ مجید امجد نے پنواڑی کے کردار کے ذریعے وقت کی عمل آرائی کو پیش کیا ہے (۴)۔ ۸ر فروری ۱۹۴۴ء کو لکھی گئی یہ نظم ایک کرداری اور واقعاتی نظم ہے۔ اس کی سادہ کہانی یوں مرتب ہوتی ہے کہ کسی نامعلوم شہر میں ایک بوڑھا پنواڑی زندگی کے سفر کو جاری رکھنے کے لیے پان کی ایک برائے نام دکان چلا رہا ہے۔ پان لگاتے، چونا گھولتے، چھالیہ کاٹتے، کتھ پگھلاتے اس کی عمر کا سفر تمام ہو جاتا ہے۔ جس روز اس کی ارتھی اُٹھتی ہے اس سے اگلی صبح اس کا کمسن لڑکا دکان سنبھال لیتا ہے اور یوں وہ بھی وقت کے اس چکر کا حصہ بن جاتا ہے۔ صورت حالات میں کسی ناگزیر تبدیلی کے بغیر باپ کے بعد بیٹے کا دکان پر آ بیٹھنا مشیت کے جبر اور وقت کے ابدی چکر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بیسویں صدی کے وجودی تناظر میں نظم کی یہ معنویت بالکل درست ہے لیکن ایک نئے تناظر میں، ایک نئے زاویے سے، اس متن کی نئی پڑھت، ایک نئی معنویت آشکار کرتی ہے۔ نظم کی کہانی ایک فرد کا انفرادی یا شخصی تجربہ نہیں ہے۔ یہ انسان بالخصوص تیسری دنیا کے انسان کا اجتماعی تجربہ ہے۔ پنواڑی ہمارے سماج کا ایک معمولی کردار ہے؛ ان کروڑوں معمولی کرداروں کی طرح کا ایک کردار جو سرمایے کی کھپت اور گردش کے لیے ایک مشین کی طرح کام کر رہے ہیں۔ مشین کسی اندرونی مخفی طاقت کے زیر اثر مصروف، کارتو رہتی ہے لیکن اس کا مقام اور حیثیت تبدیل نہیں ہوتی اور جب ناکارہ ہو جاتی ہے تو اس کی جگہ کوئی اور مشین لے لیتی ہے، اس نظم میں یہی معاملہ پنواڑی اور اس کے بیٹے کو پیش آیا ہے۔ پنواڑی ایک ایسی معاشی سرگرمی کا حصہ ہے جس کا حاصل اسے جسم اور روح کے رشتے کو برقرار رکھنے کے لیے غذا کی صورت میں ملتا تو ہے لیکن یہ معاشی سرگرمی اس کی صورت حالات کو بدلنے کی ضمانت نہیں دیتی۔ اس معاشی عمل میں اس کی شرکت محض اس منافع کے حصول کے لیے ہے جس کا حق دار سرمایہ دار ٹھہرتا ہے۔ پنواڑی کی کہانی اکیسویں صدی کے فرد کی کہانی ہے۔

اس سلسلے کی دوسری معروف نظم 'کنواں' ہے، جس کا زمانہ تخلیق ۱۹۴۱ء ہے۔ آفتاب اقبال شمیم کے مطابق:

> ''کنواں ایک ایسی نظم ہے جو اپنے فنی محاسن سے قطع نظر موضوعی اعتبار سے شاعر کے معاشرتی، تاریخی اور کائناتی نقطۂ نظر کا کھل کر اظہار کرتی ہے۔ ایک سطح پر یہ نظم شاعر کی اسطور سازی کی صلاحیت (Myth making faculty) کو اجاگر کرتی ہے اور ایسے دیہی یا دہقانی دیوتا (Pastoral God) کا امیج ہمارے ذہن میں بیدار کرتی ہے جو نظامِ فنا و بقا میں ازل سے قوتِ تخلیق کے بل پر کائنات کو ایک دائرے میں ہانکے چلا جا رہا ہے۔'' (۵)

جب کہ عقیل احمد صدیقی کا کہنا ہے:

> ''کنواں'' کے ذریعے مجید امجد نے زمانے پر وقت کے تصرف کو پیش کیا ہے۔ پیش کش کا طریقِ کار تمثیلی ہے، جس سے زندگی کی ایک مخصوص معنویت سامنے آتی ہے جو فن کار کی نظر میں

مستقل اور دائمی ہے۔''(۶)

مذکورہ بالا دونوں آرا مشیت کے جبر کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔نظم کی یہ تعبیر بیسویں صدی کا تناظر فراہم کرتا ہے؛ ہم اسے رد نہیں کر سکتے لیکن تناظر کے بدلنے سے متن کی نئی معنویت منکشف ہوتی ہے۔اکیسویں صدی کے نظام زر کے تناظر میں اس نظم کی بازقرأت سے جو تعبیر سامنے آتی ہے وہ مذکورہ تعبیرات سے مختلف ہے۔یہاں مشیت کا جبر اکیسویں صدی کے نظام زر میں منقلب ہو جاتا ہے۔اس نظم کی پہلی لائن:

کنواں چل رہا ہے، مگر کھیت سوکھے پڑے ہیں، نہ فصلیں، نہ خرمن، نہ دانہ

نئے نظام زر، اس کی چیرہ دستیوں اور نتائج کی مکمل داستان پیش کر رہی ہے۔نظم کا عنوان 'کنواں' بذات خود نئے سرمایہ دارانہ نظام کی تمثیل ہے۔کنواں اپنی گہرائی، تاریکی، مستقل گردش، پیداوری عمل اور پیداواری عمل کی مخفی طاقت کی بنا پر سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کی علامت ہے۔کنویں والے کا گادی پر لیٹ کر آرام کرنا اور سوکھے کھیتوں اور دھول ہوتی فصلوں سے اس کی لاتعلقی سرمایہ دار کی اجارہ داری، آرام طلبی، تعیش پسندی، کم محنت کے عوض زیادہ منافع کے حصول اور سرد مہری کی طرف اشارہ کرتی ہے۔جب کہ اس سارے عمل کا مرکزی کردار اور سبب ہونے کے باوجود بیلوں کا بغیر کسی احتجاج کے چپ چاپ گھومتے رہنا مابعد جدید فرد کے اس تصور کی تصدیق کرتا ہے جو جو موجودہ نظام زر نے تشکیل دیا ہے۔یہ نظام زر ورائے قومیت، آزاد تجارت، آزاد معاشی منڈی اور نیولبرل ازم جیسے تصورات کی مدد سے فرد کی آزادی کا دعویٰ کرتا ہے مگر معاصر زمینی صورت حال اور معاشی حقائق اس دعوے کا اثبات نہیں کرتے۔حقیقت یہ ہے کہ ایک طرف عالمی مالیاتی اداروں نے تیسری دنیا کے بیشتر ممالک کو اپنے قرضوں کے جال میں جکڑ رکھا ہے تو دوسری طرف ملٹی نیشنل کارپوریشنز اور بنکوں نے پرسنل لونز، لیز اور ڈیبٹ کارڈ جیسے حربوں سے افراد کو اپنے عنکبوتی جال میں کچھ یوں الجھا لیا ہے کہ انھیں یہ سمجھ نہیں آتی کہ اب 'کون سے دھاگے کو جدا کس سے کریں'۔این جی اوز کے مقرر کردہ انسانی حقوق، سرمایہ دارانہ جمہوریت، لبرل ازم اور شخصی آزادی کے خوش کُن تصورات کے باوجود اکیسویں صدی کا انسان پابہ زنجیر ہے:

بیڑیاں، قیدی ترے پاؤں میں ہیں تاگے نہیں
دیکھ پاپی! اپنے سر پر تیز سنگینوں کی چھت
چار سُو لوہے کی سیخوں کی فصیل بیکراں
تو اِدھر بے دست و پا بے حس و حرکت، بے سکت
اور اُدھر اس سوچ میں ہیں تیرے ظالم پاسباں
دُکھ کی کالی کوٹھڑی سے تو کہیں بھاگے نہیں
بیڑیاں قیدی! ترے پاؤں میں ہیں تاگے نہیں

(قیدی)

نہ سمجھو کہ ہے کیف پرور یہ نغمہ
شکن ہے ہوا کی جبیں پر یہ نغمہ

یہ ہستی کا دریا بہا جا رہا ہے
ہم آہنگ سیلِ فنا جا رہا ہے
پھنسے کچھ انوکھے قرینوں میں ہیں ہم
حبابوں کے نازک سفینوں میں ہیں ہم
یہ کیا ہے یہ کیوں ہے، خبر کیا، خبر کیا
مرے تیرہ ادراک کی ہو سحر کیا
یہ دنیا ہے میری کی مرقد ہے میرا؟
یہاں بھی اندھیرا، وہاں بھی اندھیرا
(دنیا)

اوپر حوالہ دی گئی نظموں میں بالخصوص اور مجید امجد کی کم وبیش تمام شاعری میں بالعموم حُزن کی ایک لہر مستقل موجود رہتی ہے۔ جعفر طاہر نے درست کہا ہے کہ: ''اردو میں ان (مجید امجد) کی طرح حزن و ملال کی سچی شاعری کسی نے نہیں کی۔''(۷) اس حزن کا سبب محض مجید امجد کی نجی زندگی، نا آسودگی، لا حاصلی اور محرومی نہیں ہے۔ موت اور احساسِ فنا کے علاوہ اس کا ایک اہم محرک آشوب زمانہ بھی ہے۔ ایسی نظموں میں (جو اجتماعی کرب کا اعلامیہ ہیں) عمومی شعری روایت کے برعکس طرز اظہار کی ایک معکوس صورت نظر آتی ہے۔ یہاں ''اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا'' کے روایتی محاورے میں ذاتی دُکھ اور زمانے کے دُکھ کی فوقیتی ترتیب اُلٹ جاتی ہے۔ مجید امجد نے زمانے کے دُکھ کا اظہار پہلے اور ذاتی دُکھ کا اظہار بعد میں کیا ہے۔ 'چولھا'، 'بھکشا'، 'دورنو'، 'گداگر' اور 'توسیع شہر' جیسی نظمیں بہ طور مثال پیش کی جا سکتی ہیں جہاں انفرادی اور اجتماعی دُکھ باہم آمیز ہیں یا زمانے کا غم، ذات کے غم کا سبب ہے یعنی شاعر کا غم زندگی کی اجتماعی صورت حال کا اعلامیہ ہے۔

یہ صورت حال نہ صرف انسانوں کو بلکہ گردوپیش کے تمام مظاہر کو بھی درپیش ہے۔ اس لیے مجید امجد اپنے غم کی اقلیم میں معمولی اشیا، جانوروں اور فطرتی مظاہر کو بھی شریک کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اس رویے کو جمادات، حیوانات اور حشرات الارض وغیرہ کے ساتھ دردمندی کے جذبے پر محمول کیا ہے۔(۸) جب کہ ناصر عباس نیر نے ادبی اشرافیہ کی طرف سے حاشیے پر دھکیلی گئی معمولی اشیا اور مظاہر کو متن کے مرکز میں لانے کی کوشش کو ادبی اشرافیہ کی شعریات ترک کرنے اور اس کے مقابل نئی شعریات وضع کرنے کے خاموش مگر فعال پراسس سے تعبیر کیا ہے۔(۹) درحقیقت یہ معمولی اشیا نہ صرف ادبی اشرافیہ کی قائم کردہ شعریات کو ترک کرتی ہیں بلکہ سماجی اور اقتصادی اشرافیہ کی پیش کردہ حقیقتوں کو بھی چیلنج کرتی ہیں۔ نئی معاشی تھیوری قابل صرف اشیا کی تشکیلی حقیقت کو پیش کرتی ہے۔ یہ شاپنگ مالز، قیمتی برانڈز اور سٹیٹس سمبل کی حامل اشیا کو متعارف کراتی ہے۔ مجید امجد کے ہاں معمولی اشیا اور مقامی/دیہاتی کلچر کا تصور برانڈز اور کارپوریٹ کلچر کے مقابل 'غیر' کے طور پر سامنے آیا ہے۔ ان اشیا کی قائم بالذات حیثیت ان کے ساتھ دردمندی کے داخلی احساس کو اُبھارتی ہے لیکن ان کی علامتی حیثیت سے کچھ اور معنی متبادر ہوتے ہیں۔ بیل زرعی معاشی نظام کا مرکزی کردار

ہے۔ مجید امجد کے ہاں ایک سے زاید نظموں (کنواں، ہڑپے کا ایک کتبہ، گوشت کی چادر) میں اس کا ذکر آیا ہے۔ یہ ایک خوبصورت مست خرام اور طاقت ور جانور ہے لیکن مجبوری کا طوق اس کی تمام طاقت سلب کر چکا ہے اور اب اس کی حیثیت ایک کارآمد پُرزے سے زیادہ نہیں۔ گدھا نچلی سطح کی معاشی سرگرمیوں کا اہم جزو ہے، جس کا کام صرف دوسروں کا بوجھ اُٹھانا ہے۔ اس کی استعداد سے زیادہ کام، اس کی محنت کا استحصال ہے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محرومی اور خالی الدماغی اس کی فطرت ثانیہ بن چکی ہے۔ چیونٹی کمزور ترین جاندار ہے جو حصول رزق کے لیے اپنے سے کئی گنا زیادہ بوجھ اپنی کمر پر اُٹھاتی ہے۔ یہ کسی کے پاؤں کے نیچے آکر کچلی بھی جائے تو اس کی موت کوئی واقعہ نہیں بن پاتی، نالی کا کیڑا اس وسیع دنیا میں نفرت اور حقارت کا استعارہ ہے۔ بوڑھی بھکارن معاشی بدحالی اور بے بسی کی تجسیم ہے جب کہ نہر دوارے درختوں کا قتل فطرت پر انسانی تصرف کا اشارہ ہے کیوں کہ سرمایے کی ہوس نے فطرت کا استحصال اپنا حق سمجھا ہے۔ یہ تمام ناقابل التفات مخلوقات موجودہ نظام زر میں انسان کے کردار کی نمایندگی کرتی ہیں۔

نئی معاشی تھیوری اپنی اساس میں انسان مرکز ہے۔ اس کا سارا تاروپود انسانی ضرورت اور انسانی استعمال سے متشکل ہوتا ہے۔ اس میں انسان کو کم از کم اشیائے صرف کی حیثیت تو حاصل ہے لیکن دیگر مخلوقات کو یہ مقام بھی حاصل نہیں ہے، ان کی حیثیت سرمایے کے پیداواری عمل میں معاون خام مال کی ہے۔ مجید امجد کی وضع کردہ شعریات میں یہ اشیا، مخلوقات اور معمولی انسانی کردار اشرافیائی زندگی کی چکا چوند کے مقابل ''غیر'' کے طور پر ظاہر ہو کر اس کا استرداد کرتے ہیں اور یوں نظام زر کی تشکیلی حقیقت کے مقابل زندگی کی اصل حقیقت کو پیش کرتے ہیں۔ اس تناظر میں مجید امجد کی دو نظموں 'بھکارن' اور 'کہانی ایک ملک کی' کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ نظم 'بھکارن' کے تین مصرعوں پر مشتمل پہلے بند میں نظام زر کی دنیا کو 'رہگزر کے دورویہ سبزہ وکشت رچارسُو ہنستی رنگتوں کے بہشت' کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ جب کہ اگلے مصرعوں میں 'کنکروں پہ جبیں رگڑتی، راہگیروں کے پاؤں پڑتی' بھکارن کو 'سرخ پھولوں سے اک لدی ٹہنی' کہہ کر غیر حقیقی بہشت کی پرزور تردید کر دی گئی ہے۔ 'کہانی ایک ملک کی' کا Locale بیک وقت دیہاتی بھی ہے اور شہری بھی۔ اس نظم کا Fabric دیہاتی زندگی سے وابستہ اشیا اور کرداروں سے تیار ہوا ہے یعنی نمبردار، میراثی، حقہ، عمامہ اور ہل وغیرہ سے۔ جب کہ راج محل، کار اور گھومتے پہیے شہری زندگی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ نظم دو حصوں پر مشتمل ہے۔ یہ دو حصے دو مختلف تصویریں پیش کرتے ہیں۔۔ پہلا حصہ طویل ہے۔ یہ اکیس (۲۱) مصرعوں پر مشتمل ہے۔ یہ طوالت دنیا پر سرمایہ داری نظام کے غلبے کے مترادف ہے (یہاں ۲۱ کے فگر کی معنویت بھی دلچسپ ہے)۔ یہ حصہ دولت کی ریل پیل، اقتدار، طاقت، شان و شوکت اور رعب دبدبے کو پیش کرتا ہے۔ دوسرا مختصر حصہ سات مصرعوں پر مشتمل ہے، یہ کسانوں اور مزدوروں کی محدود دنیا کی عکاسی کرتا ہے جو آگ پی کر پھول کھلاتے ہیں اور نظام زر کی ہر راحت کو ٹھوکر پر رکھتے ہیں۔ اس نظام زر کا ایک خطرناک پہلو یہ بھی ہے کہ یہ دنیا بھر سے ذہانت اور علم خریدتا ہے۔ ذہین افراد اس کے مفادات کے لیے خوش نما فسانے تراشتے ہیں اور اس مقصد کے لیے صحافت، ادب اور سوشل میڈیا کو بطور ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ مجید امجد کے عمومی شعری مزاج کے برعکس مذکورہ نظم میں غصے اور تضحیک کا پہلو حاوی ہے لیکن نظام زر اور اس کے مفادات کے محافظ حیلہ سازوں پر اس سے بہتر طنز کی مثال ڈھونڈنا بھی مشکل ہے:

راج محل کے اندر اک اک رتناسن پر
کوڑھی جسم اور نوری جامے
روگی ذہن اور گردوں پیچ عمامے
جہل بھرے علامے
ماجھے، گامے
بیٹھے ہیں اپنی مٹھی میں تھامے
ہم مظلوموں کی تقدیروں کے ہنگامے
جیبھ پہ شہد۔۔۔اور جیب میں چاقو
نسل ہلاکو!

مجید امجد کے ہاں 'مسلخ'، 'رودادِ زمانہ'، 'مشرق و مغرب'، 'نژادِ نو'، 'جاروب کش'، 'منزل'، 'ایک نظم'، 'گوشت کی چادر'، 'کلبہ و ایواں'، 'مقبرہ جہانگیر'، 'یہی دنیا'، 'طلوع فرض'، 'جہان قیصر و جم'، 'قیصریت'، 'نہ کوئی سلطنت غم ہے نہ کوئی اقلیم طرب' اور کئی دوسری نظموں میں اور غزلیہ اشعار میں احتجاج کی لہر کو بہ آسانی نشان زد کیا جا سکتا ہے۔ مجید امجد نے کہا تھا:

ہم نے بھی اپنی نحیف آواز کو
شاملِ شورِ جہاں کرنا تو ہے!
(ایک نظم)

شورِ جہاں میں مجید امجد کی آواز نحیف نہیں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اپنے زمانے کی غالب تحریک کے برعکس مجید امجد کے ہاں احتجاج اور مزاحمت کا رنگ تھوڑا مختلف ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں اس کے ہاں بھی ردعمل اور غصے کی کیفیت غالب آ گئی ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی اس نے ادب کی جمالیاتی قدر کو للکار پر مقدم رکھا ہے۔ یوسف کامران کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے مجید امجد نے کہا تھا کہ میرے نزدیک 'شاعری عمل خیر کا تسلسل' ہے۔ (۱۰) واحد معنی کا تسلط تسلسل میں رکاوٹ بن سکتا ہے، معانی کا ملتوی ہونا اور ہوتے چلے جانا 'خیر کے تسلسل' کی ضمانت دیتا ہے۔ مجید امجد کے کلام میں معانی کی وسعت اور نئے تناظرات میں اس کے کلام کی معنویت کا برقرار رہنا مجید امجد کے 'خیر کا تسلسل' ہی تو ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ارون دھتی رائے، لا محدود انصاف کا الجبرا، (لاہور: وین گارڈ بکس، ۲۰۰۹ء)، ترجمہ: شفیق الرحمان میاں، ص ۱۴

۲۔ آفتاب اقبال شمیم، مجید امجد کی شاعری ایک جائزہ، مشمولہ: مجید امجد: نئے تناظر میں، (لاہور: بیکن بکس، ۲۰۱۴ء)، مرتبہ: احتشام علی، ص ۱۳۳

۳۔ ناصر عباس نیر، متن، سیاق اور تناظر، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء)، ص ۱۸۵۔۱۸۶

۴۔ نوازش علی، مجید امجد: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، (لاہور: اردو اکیڈمی پاکستان، ۲۰۱۴ء)، ص ۳۴۹

۵۔ مجید امجد کی شاعری ایک جائزہ، مشمولہ: مجید امجد نئے تناظر میں، ص ۱۳۴

۶۔ عقیل احمد صدیقی، جدید اردو نظم: نظریہ و عمل، (لاہور، بیکن بکس، ۲۰۱۴ء)، ص ۳۱۸

۷۔ جعفر طاہر، بحوالہ: مجید امجد: حیات، شعریات اور جمالیات، از: ناصر عباس نیر، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، ص ۱۰۹

۸۔ وزیر آغا، مجید امجد کی داستان محبت، (لاہور؛ معین اکیڈمی، ۱۹۹۱ء)، ص ۷۰۔۷۱

۹۔ ناصر عباس نیئر، مجید امجد: حیات، شعریات اور جمالیات، ص ۱۱۹

۱۰۔ مجید امجد، بحوالہ: مجید امجد: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، از: نوازش علی، (لاہور: اردو اکیڈمی پاکستان، ۲۰۱۴ء)، ص ۳۰۹